ڈاکٹر رشید الوحیدی جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

ہندوستان میں مولانا آزاد کی سیاسی جدّوجہد
(ان کے ماضی کے تناظر میں)

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت یہ ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لئے ضروری سمجھا اور اسی پر مسلمانوں اور دوسری قوموں کو دعوت دیتے رہے۔

یہ بصیرت ان کو قرآن پاک کے مطالعے سے حاصل ہوئی تھی، اور قرآن پاک کا یہ خاص فہم جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا کی دین تھی نیز عالم اسلام میں انقلابی کام کرنے والوں کے طریقۂ کار کا بھی اس میں بڑا دخل تھا۔

مولانا آزاد بچپن ہی سے غور و فکر کے عادی تھے، اپنے اساتذہ اور مربیٔ خاص یعنی اپنے والد مولانا خیر الدین صاحب سے بحث مباحثہ کیا کرتے تھے کیونکہ مروجہ نصاب اور ان کے پرانے دلائل سے انہیں تشفی نہیں ہوتی تھی۔

ہندوستان کی سیاست میں مولانا کو اپنے اس موقف پر قائم رہنے، اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو اس رجحان پر لانے کے لیے کتنی سخت محنت کرنی پڑی، جنگ آزادی کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد انگریز کے لئے ایک بہت بڑی خطرے کی گھنٹی تھی، ادھر مسلمان اپنے لئے مخصوص حقوق کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو جاتے اور دوسری قومیں بھی رعایتیں چاہتی تھیں، ہر کشمکش میں بار بار اتحاد کا خواب چکنا چور ہو جاتا اور مولانا کی کوششیں حکومت کی چالوں اور انبار وطن کی ضد کی نذر ہو جاتیں۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ہمیں ماضی کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ اندازہ ہو سکے۔ ہندوستان کی جدوجہد میں ان کی پوری زندگی کی چھاپ

الولی حیدرآباد
کہاں تک تھی۔

بچپن

ہم اسے مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کی دلچسپ داستان سے شروع کرتے ہیں۔ گو اصلاً تو یہ مقالہ مولانا کی سیاسی بصیرت اور ان کی عملی جدوجہد سے متعلق ہے لیکن ضمناً یہ پتہ چل سکے گا کہ مولانا کی طبیعت کا، ان کے بچپن کا اور جوانی کے احوال کا ان کے سیاسی لائحہ عمل اور ان کی عملی جدوجہد پر کہاں تک اثر پڑا۔

مولانا کے بچپن کی پابندیوں کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے باہر کس طرح نکلے، ان کے والد بہت بڑے عالم مگر ساتھ ہی اپنے خاص مسلک میں اس قدر متشدد تھے کہ اپنی اولاد کو مدرسے اور عام اساتذہ و اہل علم کے فیض سے بھی محروم رکھا، چند جملے مولانا کے سنیئے:

"اپنے دونوں سخت معیاروں کی وجہ سے یعنی مذہبی و علمی کوئی شخص ان کی نظر میں نہ جچا، جتنے عمدہ طور پر اور وسعت کے ساتھ وقت کے بہترین عالموں یا درسگاہوں سے تحصیل کر سکتے تھے نہ کر سکے۔ والد صاحب سمجھتے تھے کہ باہر کی ذرا سی بھی آب و ہوا ہمیں گندہ کر دیگی"

(مولانا آزاد کی کہانی)

مولانا کے بچپن کے ان واقعات کو پڑھئے تو ذہن پر دو قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں، ایک نتیجہ تو اس ماحول اور طریقۂ تربیت کی دین نظر آتا ہے یعنی مولانا کی زبان میں

"اس طرح جذبات افسردہ ضرور ہو گئے اور ان کی جگہ قبل از وقت افسردگی نے لے لی اور پھر اس طرف ایسے لگے کہ تمام جذبات کا مصرف مطالعہ و درس ہی ہو گیا" (ایضاً)

اس کے بالمقابل دوسرا رنگ وہ ہے جسے خدا کی طرف سے کہنا چاہئے یعنی بندھے ٹکے نظام اور ماحول کی پابندی سے نکلنے کی تڑپ اور شوق۔ اسی شوق میں مولانا نے بعض اردو کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو وہ بھی چھپ کر کرنا پڑا کیونکہ ایک طرف والد کا ڈر دوسری طرف طبیعت کا تقاضا۔ لہٰذا ان پابندیوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو نہ روک سکے۔

بے چینی کا دور

قدیم درسیات اور نصاب کے مروجہ اور پرانے طریقے سے وہ اس قدر غیر مطمئن ہوئے کہ اکثر اپنے اساتذہ اور کبھی کبھی اپنے والد سے بحث کرنے لگتے تھے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مباحث و مسائل پر اساتذہ سے بڑی سرگرم بحثیں رہنے لگیں نور انور انوار میں انحصار مذاہب اربعہ اور اجماع مرکب کی بحث ایک ہفتے تک جاری رہی، تین اساتذہ اکٹھے ہوگئے قواعد منطقیہ سے خوب تقریر میں کام لینے والے، اس کی تقریریں خوب منجھی ہوئی تھیں یہ اساتذہ بڑی بڑی تیاریوں کے ساتھ صبح کو آتے، لیکن میری تشفی نہیں کرسکتے تھے، بعض اساتذہ ایسے تھے کہ ان کو استحضار بلا کا تھا۔ صفحوں کے صفحے کتابوں کے برزبان تھے، انہوں نے بڑے زور لگائے خاص طور پر کتابوں کا مطالعہ کیا پھر اپنے ساتھ فتح القدیر، دیگر شروح ھدایہ شقائق النعمان، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی امام الکلام وغیرہ بھی لائے لیکن میرے اعتراضات بند نہ کرسکے، سال بھر کے بعد میں ایک مستقل ذاتی فکر و رائے کے قریب پہنچ چکا تھا"

یہی وہ مستقل ذاتی فکر و رائے کی قوت تھی جو آگے چل کر زندگی میں ہر فیصلے کے وقت ان کے لئے ابھرا اور رہنما بنی۔ مولانا کی افتادِ طبع اور بچپن والی یہ جرأت انہیں کہاں کہاں لے گئی۔

باہر کی دنیا

۱۹۰۰ کے آس پاس تقریباً سولہ برس کی عمر میں سب سے پہلے خارجی اثرات کے لحاظ سے وہ سرسید کی تحریر سے متاثر ہوئے، اور یہ تاثر اس حد تک بڑھا کہ ان کا روایتی ذہن سرسید کی عقلیت پسندی سے ہل کر رہ گیا اور بقول خود

"وہ سرسید کے سحر میں ایک ممریزم کے معمول کے طرح گرفتار ہو کر رہ گئے"

گویا جدید اصطلاح میں Rationalism نے Traditionalism کی برتری کا اعتراف کرلیا۔ وہ کہتے ہیں :-

"اس کے سامنے فکر و عقائد کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آتی تھیں"

سرسید کی تفسیر اور تہذیب الاخلاق کے مضامین سے مولانا اعتزال سے متعارف ہوئے اور جب وہ اس میدان میں اترے تو دور تک چلے گئے اور ایک موقع پر معتزلہ کی تاریخ و مسائل پر ان کے جستہ جستہ اقوال و آرا جمع کر کے ایک کتاب لکھنے کا داعیہ بھی پیدا ہوا تھا۔ یہ شوق اور یہ انہماک کیسے ختم ہوا مولانا صرف یہ فرماتے ہیں:

"ایسے حالات پیش آئے کہ اس طرف سے طبیعت اچاٹ ہو گئی"

وہ کیا حالات تھے اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمیں تو یہ دکھلانا ہے کہ مولانا ایک مقام سے دوسرے مقام کی سیر کرتے رہے، طبیعت کی بے چینی و بے قراری نے کتنی ہی وادیاں طے کر لیں اور ان پر ایک مقام وہ بھی گذر گیا جب نہ سب میں آزادی و جولانی، شکوک و شبہات نے سر اٹھایا، سرسید کے مسلک نے پچھلی تمام خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ و بن سے اکھاڑ دیئے اور مولانا عمل بھی چھوڑ بیٹھے، فرماتے ہیں؛

عقائد شکوک و اضطراب میں بہہ گئے اُدھر عملی زندگی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔
ایک شب کو آخری فیصلہ کر لیا، صبح سے نماز ترک کر دی"

یہ ساری واردات و کیفیات اکثر انسانوں پر گذری ہیں اس لئے کچھ عجیب نہ تھیں۔ بقول ڈاکٹر عابد صاحب مرحوم

"سچی مذہبی طبیعتوں پر یہ واردات اکثر گذری ہے، مگر وہ تاریخ جو اس کی خبر دیتی ہے یہ بھی بتاتی ہے کہ آخر میں ہمیشہ مذہبی عقیدہ پہلے سے کہیں زیادہ گہرائی اور مضبوطی کے ساتھ اپنا سکہ بٹھا کر رہتا ہے"

(مسلمان آئینہ ایام میں ـــــ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم)

یہ بات مسلّم ہے کہ مولانا کے ذہن کو کوئی شخصیت یا کوئی مسلک کتنا ہی اپنی گرفت میں لے لے تاہم وہ اس سے باہر بھی سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی خداداد فکری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس دور کے اپنے محسن، جن کو وہ "داعیٔ اعظم" کہا کرتے تھے، سرسید کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں نے سرسید سے سب سے بڑی چیز جو اس وقت پائی تھی وہ یہی

ترک تقلید تھی مفسرین کی، فقہا کی، محدثین کی، متکلمین کی، تمام علماء کی، تیرہ سو برس کے تمام اجتماعی عقائد و سیاست کی، تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلد اعمیٰ بلکہ تقلید کے نام پر ان کی پرستش کرتا تھا لیکن کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ سرسید اس سے کیوں مستثنیٰ ہو جائیں گے، ان کے مجتہدات کے تسلیم و اذعان میں اس درجہ استغراق اور اس کے نقص و ضعف سے اس درجہ مبرا ہونے پر یقین کامل کیوں۔"

دیکھا آپ نے مولانا کا مخصوص رنگ، یہاں اس بات کو مان لینے میں کیا چیز مانع ہے کہ اگر یہ بے یقینی اور اضطراب مولانا کو راستے سے بہکا کر انکار و شبہے کی طرف لے گئی تو وہی بے یقینی اور تلاش پھر صحیح فکر کے لئے رہنما بنی۔

مشرق وسطیٰ کا سفر

۱۹۰۸ میں وہ مصر، شام، عراق، ترکی وغیرہ کے سفر پر گئے جہاں ان کی ملاقات جمال الدین افغانی کے شاگردوں شیخ محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا سے ہوئی، مولانا پہلے سے بھی ان کے خیالات و نظریات سے عربی اخباروں کے ذریعے واقف تھے اب ملنے اور قریب سے مطالعے کا موقع ملا، اس کے علاوہ عرب نیشنلزم اور ینگ ترک کو دیکھا، سمجھا۔ افغانی کی کوششوں سے عالم اسلام کے مسلمانوں میں جو سیاسی بیداری کی لہر پیدا ہوئی تھی مولانا اس کی قدر کرتے تھے اور اس سے متاثر تھے، چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے اخبار الہلال میں جمال الدین کی اس خدمت کا کھل کا اعتراف کیا کہ انہوں نے سوئی ہوئی ملت کو بیدار کیا اور وقت کے تقاضوں کو پہچاننے کی دعوت دی۔

بہر حال جمال الدین افغانی اور المنار اسکول کے یہ اثرات ہندوستان کی سیاسی جدوجہد اور یہاں کے انقلابی کاموں میں مولانا کے لئے معاون بنے اور اسی کا ایک دوسرا اثر یہ بھی تھا کہ مولانا اب تمام تر قرآن و سنت کے ہو رہے، خدمتِ وطن، جہاد و حریت اور سیاسی بیداری کا یہ وہی رنگ تھا جسے انہوں نے اپنے الفاظ کی شوکت اور خطابت کے سحر سے ہندوستان کے علماء اور عوام کے قلوب میں اتار دیا۔

اصل موضوع

انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام اور ہندوستان میں اپنے قیام کے لئے سب سے بڑا حربہ یہ استعمال کیا کہ ہندوستانیوں میں اتحاد واتفاق کو نہ پنپنے دیا جائے۔ یہ آپس میں کٹتے مرتے رہیں اور ہمارے محتاج بنے رہیں، مولانا اس وقت دو دو غموں کا شکار تھے ایک طرف وہ حکومت کی اس چال کو سمجھ رہے ہیں وہ اپنی تحریروں میں اس طرف توجہ دلاتے تھے

"مسلمانوں کو اس کی تدبیر کرنا چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لئے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کر سکے" (خطبات آزاد)

دوسری طرف انہیں یہ غم تھا کہ ہندو مسلمان اپنی ناسمجھی سے انگریز کی اس چال کا شکار ہو جاتے تھے۔ حکومت کی کرم فرمائیوں سے تقسیم بنگال، رولٹ بل کا توہین آمیز رویہ، جلیان والا باغ کا سفاکانہ واقعہ، اردو ہندی اور ناگری کا مسئلہ، سول سروس کے امتحان کا جھگڑا، تقسیم بنگال کی تنسیخ کا سوال۔ غرض کیسے کیسے ساحرانہ اور مکارانہ حربے سے ہندوستانی بھائیوں کو لڑایا جا رہا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کی دعوت جو مولانا دے رہے تھے، اس زہر کا کتنا بروقت اور عمدہ تریاق تھا، جب مسلم ذہن فرقہ واریت یا جداگانہ انتخاب کی بھول بھلیوں میں گم تھا تو مولانا کی درد بھری پکار ان کو اس ناعاقبت اندیشی سے نکلنے کی دعوت دیتی تھی اور اس اندازِ فکر کے مہلک نتائج سے ان کو آگاہ کرتی تھی۔

۱۹۲۱-۲۲ء میں محض انگریزوں کی درپردہ چالوں سے جب شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ ہوا جس کے نتیجے میں ملک میں فساد وبلوے ہوئے تو مولانا تڑپ گئے مگر انہوں نے حوصلہ نہیں چھوڑا ۲۳ء میں دہلی میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بلایا اور پھر اپنی سیاسی پالیسی اور بصیرت کا مظاہرہ کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں تجویز میں سوچنے اور تدابیر اختیار کرنے کے لئے ریزولوشن پاس کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مولانا کا یقین قرآنی بصیرت کی دین تھی ان کا اعلان تھا:

"ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی قرآن سے سیکھے ہیں۔ قرآن انتظامِ عالم

کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استیلاء واقتدار کی مخالفت کرے۔
پس مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لئے
کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انہیں جب تک نہ مل جائے، اپنے
اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں"

عالم اسلام کے مفکرین اور عرب، ایران، مصر و ترک کے مجاہدین کے انقلاب آفریں پیغام کا کرشمہ تھا جو مولانا نے وہیں ایک عہد ساز فیصلہ کر لیا۔

"مجھے اس کی ضرورت محسوس کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جاکر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جدوجہد کروں گا۔ (ہماری آزادی)

وہ آزادی کو دوسرے تمام حقوق اور مفادات پر ترجیح دیتے تھے اور بلا کسی شرط کے حاصل کرنا چاہتے تھے، بلاشبہ یہ نقطۂ نظر مسلمانوں میں اس طبقے کے ذہن سے متصادم تھا جو ملک کی آزادی سے پہلے اپنے مخصوص مفادات اور حقوق کے تحفظ کی گارنٹی چاہتا تھا۔

اتحاد کی دعوت مولانا شروع ہی سے دیتے آرہے تھے، "الہلال" کی پالیسی پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"جولائی ۱۹۱۱ء میں الہلال کا پہلا پرچہ نکلا، اس میں بڑا نمایاں مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا، مسلمان کا ایک ہی فریق ہے جس سے عالم گیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ برٹش گورنمنٹ ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر کوشاں ہوں (خطبات)

اس طرح مولانا جنگِ آزادی کی لڑائی ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ لڑنا اور جیتنا چاہتے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اپنی اس پالیسی کے لئے وہ کہیں اور سے نہیں، قرآن و سنت سے روشنی حاصل کرتے تھے، قومی اتحاد کی مثال وہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی سے لاکر مسلمانوں کے

اثرات کا کافی عکس تھا خود انہیں کے الفاظ میں واضح ہو جاتی ہے:

"عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقائد راسخ ہو گئے، ان انقلابیوں کو اس چیز پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبے کی طرف سے بے اعتنائی اور سرد مہری برتتے ہیں یا ان کی مخالفت کرتے ہیں، مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا چاہیے اور اس کی تدبیر کرنا چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لئے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کر سکے۔" (ہماری آزادی)

مولانا کے ذہن میں اخوت و محبت کا تصور سارے عالم کے انسانوں کے لیے وسیع تھا پھر اپنے ملک کے بسنے والوں کو کیوں کر محروم کر سکتے تھے، فرماتے ہیں:

"اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اسی لئے محترم ہے تو وہ خاکِ تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترام کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترام و اخوت کے مستحق ہیں جو اسی خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے والے اور اسی فضاء محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔" (خطبات)

ایک جگہ اور موجودہ زندگی کا رشتہ ماضی سے جڑا ہوا نظر آتا جب ایک فاضل اہلِ قلم کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

"پان اسلام ازم کا تصور ہی فی الواقع ہندوستان کی اس عظیم الشان تحریک خلافت کا محرک تھا جس نے بین المللی وحدت کے ساتھ ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد اور جنگ آزادی کی متحدہ قومی و عوامی جدوجہد کا صور پھونک دیا، ترکِ موالات یا عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا اور بالآخر جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر سے برطانوی سامراج کا خاتمہ کر کے اہل ملک کے ہاتھوں

ذہن کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں سے مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عہدنامہ لکھا بعینہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں انہٗ امۃ واحدۃ، ہم ان تمام قبیلوں سے جو عرب کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب ایک نیشن بننا چاہتے ہیں۔" (خطبات)

ایک جگہ فرمایا:

"اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستانی مسلمان اپنا بہترین فرض اس وقت انجام دیں گے جب ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول نے اس وقت لکھوا دیا تھا کہ ہم سب مل کر بمقابل قریش ایک نیشن ہو جائیں گے۔" (خطبات)

جو لوگ دوسری قوم کے ساتھ موالات اور محبت کو تسلیم نہیں کرتے تھے مولانا انہیں قرآن ہی سے جواب دیتے تھے اور لاینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین کے تحت جس قسم کی قومیں اور غیر مسلم داخل ہیں ان کے بارے میں فرماتے کہ

"ایسے غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد اور ہر طرح کی نیکی کرنی چاہیے"۔ (خطبات آزاد)

عالم اسلام کی سیاسی بیداری کا موازنہ کرکے مولانا یہاں کے مسلمانوں کی حالت کا مقابلہ کرتے اور جائزہ لیتے:

"مصر، ایران اور ترکی میں مسلمان جمہوریت اور آزادی کے حاصل کرنے کے لئے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہو جائے گی۔"

یہ بات کہ ہندوستان کی سیاست میں ان کے ماضی اور خصوصاً مشرق وسطیٰ کے

اقتدار کی منتقلی کا سامان کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے اہم قائد، نظریہ ساز اور مجاہد تھے۔" (ایوان اردو آزاد نمبر دہلی مضمون عبدالغنی صاحب پٹنہ)

مولانا، ہندوستانی مسلمانوں کو عزت، وقار، خودداری اور شرافت کے ساتھ آئینی جنگ لڑکر اپنا حق وصول کرنا سکھاتے رہے، وہ مسلمانوں کو کاسہ لیسی اور گداگروں کی طرح بھیک مانگتا نہیں دیکھ سکتے تھے، اپنے حقوق کے لئے لڑنا، اپنا حق چھین لینا، اس قسم کی اخلاقی جرأت ان کا مطمح نظر تھا،

جو قوم چالیس برس سے محض حکومت کی بھیک اور دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی ہو، جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے انکار کیا ہو، جس نے ہر موقع پر پولیٹکل جد و جہد کو ایک جرم و بغاوت سمجھا اور جس نے خود کبھی کچھ نہیں کیا مگر ہمیشہ کام کرنے والوں کی تضحیک اور تحقیر کی اور طرح طرح کے باغیانہ خطابات سے انہیں یاد کیا آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پرواہ کرے۔" (مضامین ابوالکلام آزاد)

ہمیں ہندوستان کی جنگ آزادی کی مکمل تاریخ نہ لکھنی ہے نہ ایک "مقالہ" متحمل ہوسکتا ہے "آزادی مل گئی، ملک تقسیم ہوگیا، آیئے ایک جھلک مولانا کے اس دور کی بھی دیکھ لی جائے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جامع مسجد دہلی میں ——— وہی دو قومی نظریے کا ذکر۔

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قومی نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔"

"اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگ گراں کا حکم رکھتی ہے۔" ——— مگر اب یہ تنبیہ یہ یاددہانی لاحاصل تھی۔

اس لئے اب مولانا سیاست کے علاوہ مسلمانوں کی سماجی، دینی، تعلیمی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

جمعیۃ العلماء ہند جس کی مجلس عاملہ کے مولانا برابر ممبر رہے، جس جمعیۃ نے مولانا کے افکار و نظریات کو ہمیشہ اولین مقام دیا، اس کے اکابر اور علماء کی سیاسی سوجھ بوجھ، دینی و

علمی مرتبے کا مولانا آزاد نے ہمیشہ اعتراف کیا جب ۱۹۴۹ کی مجلس عاملہ نے جس کے صدر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح تھے، ایک تجویز پاس کی تو مولانا آزاد نے دل کھول کر اس کی تعریف کی، تفصیل یہ ہے!

"مولانا آزاد نے جمیعۃ العلماء کی اس پالیسی پر کہ اس نے ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد حالات کی تبدیلی کے ساتھ سب سے پہلے سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی، تحسین فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، اس وقت سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے، حکومت لازمی تعلیم کے ساتھ کسی فرقے کی مذہبی تعلیم کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مذہبی تعلیم کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے اس کے لیے وقت مقرر کردے" (ماخوذ از ریکارڈ مجلس عاملہ)

مولانا اپنے رب، اپنے پالن ہار، اپنے مولا کی رحمت میں آرام فرما ہیں۔ اللہ ان کی روح پر جم جم رحمتیں نازل فرماتے۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔